File No 2
12

سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۲۴

تاریخ اسلام میں

واقعۂ کربلا کی اہمیت

از قلم حقیقت رقم

سرکار سید العلماء علامہ علی النقی النقوی مجتہد العصر

مد ظلّہ

maablib.org

قیمت ۲/

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور

کا شاندار تبلیغی شاہکار رسالہ ۲۴ آپ کے زیرِ نظر ہے۔

یہ خلاصہ ہے اس تقریر کا جو سرکار سید العلماء علامہ علی نقی النقوی نے ۱۳۶۵ھ میں ہزارہا افراد کے مجمع میں گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں فرمائی یہ کامیاب تبلیغی تقریر اخبار پیام اسلام میں شائع ہو کر تمام حلقوں میں دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ تاریخ اسلام کا جوہر امام حسینؑ کا تذکرہ ہے جو ہر دم تازہ ہے اور یہ تقریر گلشن عزا کا سدابہار پھول ہے۔ اس کو بار بار پڑھنے سے بھی دل سیر نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر مرتبہ دل و دماغ ایک تازہ اثر لیتا ہے۔ صداقت اسلام اور عظمت آلِ محمدؐ کے احساس سے جنت بدوش کیف طاری ہو جاتا ہے۔

محرّم کے ایام میں اس کی کثیر اشاعت پر محبانِ حسینؑ کو خاص توجہ فرمانا چاہئے۔ تبلیغ حسینیتؑ خدمت اسلام کا بہترین ذریعہ ہے۔

خادم دین سیّد **حسن علی شاہ کاظمی**

سیکریٹری امامیہ مشن رجسٹرڈ لاہور

ذالحجہ ۱۳۷۵ھ ۔ جولائی ۱۹۵۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ اسلام کی ابتدا کب سے ہوتی ہے؟ مذہبی نقطۂ نظر سے تو اسلام اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ دنیا وجود میں بھی نہ آئی تھی اور آدمؑ و نیز دیگر انبیاء و مرسلین اسلام ہی کا پیغام لے کر دنیا میں آئے، لیکن مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے خالص تاریخی حیثیت سے تاریخ اسلام کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے، کہ جب سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے۔

اسوقت کی حالت یہ تھی کہ دنیا کے مختلف ممالک میں جن رہنماؤں کی تعلیم جاری تھی ان میں کسی میں بھی ہمہ گیر انسانی برادری کا تخیل موجود نہ تھا۔ بلکہ یہ تعلیمات صرف ایک قوم، ایک ملک اور ایک زمانہ میں محدود تھے۔ ہندوستان ہی کو لیجئے یہاں جس طرح کی تعلیم رائج تھی۔ اس نے اپنے پیغام کو سمندر کے حدود کا پابند بنا دیا تھا، وہ اپنے ماننے والوں کو سمندر کے عبور کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ تو اسے سمندر پار والوں کے اصلاح کی فکر کیا ہوتی۔

دوسرا بڑا مذہبی ادارہ عیسائیت کا تھا۔ اس کی تعلیم کا زاویہ نگاہ جو رواج یافتہ بائیبل میں پایا جاتا ہے اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اللہ کو صرف بنی اسرائیل کا باپ قرار دیتا ہے۔ اگر اللہ کو صرف اس کے رحم و کرم اور عنایت کی بنا پر باپ کے نام سے تعبیر کیا جاسکے تو اس کی رحمت کا مستحق دنیا کے سارے انسانوں کو ہونا چاہئیے۔ مگر عیسائیت کی مذہبی تعلیم اس وسیع النظری سے خالی تھی۔

خود عرب کے لوگ اپنے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنا نام رکھا تھا "عرب" یعنی دل کی بات کو زبان سے ظاہر کر سکنے والے اور اپنے

سوا دوسری قوموں کو کہتے تھے "عجم" یعنی گونگے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے سوا دیگر اقوام کی زبانوں کو انسانی زبان ماننے کیلئے تیار نہ تھے۔ بلکہ جیسے جانور کچھ آوازیں منہ سے نکالتے ہیں، ویسی ہی دوسری قوموں کی بولیاں ہیں۔

ایسے زمانہ میں حضرت محمد مصطفےٰ ص اسلام کا پیغام لیکر آئے۔ جس کا خاص جوہر تھا "بین الاقوامیت" یعنی وہ صرف عربوں کیلئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کیلئے تھا۔ ابھی تک کسی نے اتنا بڑا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کل انسانوں کو اخوت اور مساوات کا سبق دیا ذات پات کے بدنما داغوں کو دامنِ انسانیت سے دھوڈالا۔ کل انسانوں پر یکساں فرائض عائد کیئے اور سب کے حقوق مساوی رکھے۔ آپ نے اعلان کر دیا لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور نہ عربی کو غیر عربی پر سب آدم ع کی اولاد ہیں (خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔

یہ اب ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جبکہ ہمارے کان سنتے سنتے عادی ہو چکے ہیں لیکن جس زمانہ میں رسول ص ان خیالات کو پھیلا رہے تھے اس وقت دنیا ان سے بالکل اجنبی تھی۔ اس وقت دنیا کی تمام قوموں میں برادرانہ برتاؤ قائم کیا جانا کیسا اپنے ہی ملک و قوم کے دوسرے قبیلے کے افراد کی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس ماحول کے اعتبار سے رسول ص کا یہ اقدام ایک بڑی غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ قول سے عمل مشکل ہے۔ رسول نے زبانی ہی تعلیم نہ دی بلکہ ہر موقع پہ خود عمل کر کے دکھا دیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے دنیا کے سامنے ایک بین الاقوامی قوم کی تشکیل کر کے دکھا دی۔ جس میں اگر ایک طرف حمزہ رض و جعفر رض ایسے قرشی تھے تو دوسری طرف ابوذر غفاری رض اور مقداد کندی رض

ایسے غیر قرشی اور پھر سلمان فارسیؓ، بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ ایسے غیر عرب اتنا ہی نہیں بلکہ سلمانؓ کو مِنَّا اَهْلَ الْبَيْت کہہ کے اعزاز میں اپنے خاندان کا شریک کر لیا۔ اور بلالؓ کو موذن کے عہدہ پر فائز کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی شخص کسی بلند عہدہ و منصب کا اپنے ایمان و عمل سے حقدار ہو تو اس میں رنگ نسل اور ملک کے افتراق کی ہرگز پرواہ نہیں کرنا چاہئے حقیقی مصلح وہی ہے کہ جو ماحول کے خلاف رائے عامہ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ضروری اقدام عمل میں لائے۔

رسول اللہؐ کی جانب سے تمام دنیا کے سامنے ایک ایسی تعلیم پیش کرنا چاہتے تھے جو اسے بلند انسانی سطح پر پہنچا دے اسی لئے انہوں نے تمام اقوام عالم کے سامنے ایسا انداز اختیار کیا جس میں عقل و انصاف کی رو سے کسی کو بنائے مخاصمت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تمام قدیم پیشوایان مذاہب میں اس کا فیصلہ کرنے کیلئے کھڑے ہو جاتے کہ کون پیشوا حقیقت میں منصب رسالت پر فائز تھے اور کون نہیں تھے تو وہیں سے ایک جنگ ان شخصیتوں کے بارے میں قائم ہو جاتی جس کا کوئی عملی نتیجہ انسانی کردار کے مستقبل کے لحاظ سے نہ تھا۔ اسلئے انہوں نے اقوام عالم کے گزشتہ پیشواؤں میں سے نفی کسی کی نہیں کی۔ بلکہ قرآن میں کچھ کے نام کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ "کچھ پیغمبروں کا ہم نے تمہارے سامنے ذکر کیا ہے اور بہت سے پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا ہے" ہر ایک مذہب کے قدیم پیشوا کیلئے یہ امکان باقی رہ گیا کہ اس کا شمار بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہو اور اسطرح یہود کیلئے جس طرح یہ موقع ہے موسیٰؑ کی عظمت کے قائل رہتے ہوئے، عیسائیوں کیلئے موقع ہے کہ عیسیٰؑ کی عظمت بشری کے قائل ہوتے ہوئے اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں اسی طرح پارسیوں کیلئے موقع حاصل ہے کہ زردشت کی عظمت کو ماننے کے ساتھ، ہندوؤں کیلئے موقع ہے کہ اپنے سابق پیشواؤں کی عظمت کو انسانی حدود میں ماننے کے ساتھ ساتھ اسلام کے پیغام کو قبول کرلیں، اب ان سابق شخصیتوں کے احترام اور عدم احترام

کوئی بحث نتیجہ خیز بھی نہیں۔ جبکہ آئندہ کیلئے لائحہ عمل سب کی طرف سے ایک قبول کرلیا جائے اور وہ وہی کہ جسے اسلام دنیا کے سامنے پیش کررہا ہے۔

یہ ہے بین الاقوامی جماعت کو متحدہ مقصد پہ مجتمع کرنے کا صحیح طریقہ جسے اسلام نے اختیار کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ بیشک قرآن عربی زبان میں اترا۔ اس میں ایک پہلو تھا اس کا کہ عرب قوم جو دوسروں پہ فوقیت کی دعویدار تھی اسے اپنے لئے باعث فخر قرار دیتی۔ مگر قرآن نے اس پہلو کی تشریح کرکے عرب کے اس فخر کو ختم کردیا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ولو نزلنا علی بعض الاعجمین علیھم ما کانوا بہ مومنین۔ یعنی قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونیکا سبب صرف یہ ہے کہ عربوں میں جہالت اور تنگ نظری ایسی ہے کہ اگر یہ کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو یہ ایمان نہ لاتے برخلاف دوسری قوموں کے وہ اس تنگ نظری سے دور رہیں۔ وہ باوجود قرآن کے عربی ہونیکے ایمان لانے کیلئے تیار ہوسکتی تھیں اس لئے قرآن عربی زبان میں اتارا گیا۔ اسطرح قرآن مجید نے جو ایک پہلو عرب کی فوقیت کا پیدا ہوتا تھا اسے ختم کردیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی بین الاقوامیت کے یہ معنی نہ تھے کہ ایک قوم یعنی عرب کا غلبہ تمام دوسری قوموں پر ہوجائے بلکہ اس کے یہ معنی تھے کہ عرب اور تمام دوسری قومیں یکساں طور پر اسلام کے بلند و برتر نظریات عقلی اور اصول اخلاقی و اجتماعی کو قبول کرکے ایک متحدہ قوم بن جائیں۔ اس طرح وہ کسی سے کوئی چیز چھیننے کا درپے نہ تھا بلکہ سب کو مساوی طور پر کچھ دینے کیلئے آگے بڑھ رہا تھا اور اسی لئے کسی دوسری قوم کا آدمی اسلام قبول کرکے کسی شکست یا پسپائی کا احساس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ فخر اور نازش محسوس کرتا تھا۔

اسلام کے ان تعلیمات میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے صاف اعلان کردیا کہ (لا اکراہ فی الدین) بلکہ تبلیغ مذہب کا صرف ایک ذریعہ تھا کہ اپنی حقانیت اور عمل سے دلوں کو مسخر کیا جائے اور اپنے اصول کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ اس سے متاثر ہوکر اس کی خوبیوں پر غور کرے اور مسلمان ہو۔

یہ ہے اسلامی تاریخ کے دورِ اوّل کا وہ سرسری بیان جس سے اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور رسولؐ کے تبلیغی طریقہ کا ایک تصور ذہن میں آجاتا ہے اس کے بعد تاریخ کا ورق الٹتا ہے۔ رسولؐ کی وفات ہوتی ہے اور مسلمانوں کے فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان فتوحات کی بنیاد اسی بین الاقوامی تخیل پر تھی جو اسلام نے مسلمانوں کے دماغ میں پیدا کیا تھا۔ مگر اس بین الاقوامیت کے حصول میں پیغمبرؐ کے طریقِ کار کی نوعیت پر عام طور سے غور نہیں کیا گیا، یا نگاہیں اسکی تہ تک نہیں پہنچیں اور نہ پہنچنا چاہیئے تھا کیونکہ پیغمبرؐ کے عمقِ نگاہ کی توقع اُمتیوں کے عوام سے کہ جن کا جمہور نام ہے فضول سی چیز ہے پیغمبر اسلام کے پیش نظر بھی فتوحات تھے اور مسلمانوں کی نظر بھی فتوحات پر ہی مگر فتوحات کے مفہوم میں دونوں جگہ فرق تھا مسلمانوں کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کے ملک ان سے لیکر اپنے بنا لئے جائیں۔ اور پیغمبر اسلامؐ کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کو خود اپنا بنا لیا جائے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ملک اپنا ہو جائے۔ پہلی قسم کے فتوحات میں زمینوں پر قبضہ کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کے فتوحات میں دلوں کو تسخیر کیا جاتا ہے۔

یہ فتوحات جنہیں مسلمانوں نے اپنا نصب العین بنایا اس سے ممالک تو اپنے ہو گئے مگر ممالک کے رہنے والے ان فتوحات سے ہرگز اپنے نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اس طرح کی فتح کا ایک خاصہ ہے یہ کہ مفتوح قوم میں فاتح کی طرف سے جذبۂ نفرت پیدا ہو جائے جب دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو گا تو اچھائیوں پر نظر جائے گی نہیں اور جب اچھائیاں دیکھی نہ جائیں گی تو دلوں میں ایمان کا رجحان کیا پیدا ہو گا۔

اس قسم کے فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح کے خلاف فردِ قرار دادِ جرم مرتب کر کے اور صحیح یا غلط مظالم کی داستانیں دہرائے۔ تاریخ پر نظر ڈالیئے تو اسلامی فتوحات اس سے مستثنیٰ نظر نہ آئیں گے۔

مان لیا جائے کہ کتبخانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام غلط ہے مگر اس غلط الزام کا عائد ہونا

اور بالکل ایسے ہی الزام کا ایران کی طرف سے عائد کیا جانا ہے جسے مولانا شبلی نے شعر العجم میں بھی نقل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ایران کی قدیم شاعری اور ادبی لٹریچر کا ذخیرہ باقی نہیں رہا اس لیے کہ مسلمانوں نے ایران کے تمام تمدنی سرمایہ کو تلف کر دیا۔ ان غلط الزامات کا بالکل یکساں دو ملکوں کی طرف سے عائد کیا جانا، خود اس کا ثبوت ہے کہ مفتوحہ ممالک کو فاتح جماعت کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ جبکہ مخاصمت تھی ویسی ہی جیسی ہر مفتوح قوم کو فاتح کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

رسول نے دکھا دیا تھا کہ دیکھو ممالک یوں فتح کیے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ کو فتح یمن کے لیے بھیجا اور انہوں نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے ہوئے تمام ملک کو اپنا بنا لیا۔ مگر مسلمانوں نے اس مثال کو یاد نہیں رکھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک تو اپنے ہو جائیں مگر ملک والے اپنے نہ ہوں۔

آل محمدؐ حق کے سرگروہ حضرت علی بن ابی طالبؑ تھے اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے اور اس کے نتیجہ کو محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بمصالح سیاست وقت کی رفتار میں مزاحمت مناسب نہیں سمجھی۔ مگر انہیں الگ تھلگ اور خاموش رہ کر بھی اس کام کو انجام دینا تھا جو پیغمبر اسلامؐ کی قائم مقامی میں ان کے پیش نظر تھا۔ اگرچہ ان کا کام بہت مشکل بن گیا تھا مگر ایک فرض شناس شخص مشکلوں سے گھبرا کر اپنے فرض کو ترک نہیں کیا کرتا۔ انھوں نے اپنا کام یہ قرار دیا کہ غیر ملک کی زمینوں کو مسلمان اپنے قبضہ میں لائیں اور ان کے دلوں کو آل محمدؐ اپنے عمل اور سیرت کے جذب سے اپنا بنائیں اور اس طرح ان میں اسلام کے ساتھ حقیقی ہمدردی پیدا کریں۔

اسی مقصد سے حضرت علیؑ نے اپنے زمانہ خلافت میں بجائے مکہ یا مدینہ کے کوفہ کو اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ یہ عراق کا مرکزی شہر تھا جو ایران اور حجاز دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔ کوفہ فوجی چھاؤنی تھا۔ اور چھاؤنی میں ہر اعلاقیاں کثرت

سے ہوتی ہیں۔ ایران کے لوگ جب یہاں آتے تو وہ ان ہی اخلاق و کردار کو جو یہاں نظر آتے اسلامی کردار خیال کرتے اور اس کی وجہ سے اسلام کے خلاف ان کی نفرت مستحکم ہوتی جاتی۔

جناب امیرؑ نے یہاں قیام فرما کر اور اسے خاندانِ رسولؐ اور اپنے تربیت دادہ سچے مسلمانوں کی جماعت کا مرکز قرار دے کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ ایران والے قریب سے اسلامی اخلاق و آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے بلند انسانی خصوصیات کو محسوس کریں جبکہ آپ عملی طور پر اسی بین الاقوامی مساوات کو سختی کے ساتھ نباہ کر دنیا کو دکھا رہے تھے۔ جو پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ جہاں غیر قرشی مالک اشترؒ کی اتنی عزت تھی جتنی بڑے بڑے خاندانی قرشیوں کی نہ تھی۔ اور قنبر غلام کے ساتھ وہ مراعات تھیں جو بہت سے عربوں کے ساتھ نہ تھیں۔ جہاں انسانی حقوق میں مساوات کا اتنا خیال اور ملکی و غیر ملکی تفریق کے خلاف جہاد میں اتنا اہتمام تھا کہ عرب شہنشاہ زادہ (عبید اللہ بن عمر) نے اگر ایک ایرانی ہرمزان کو ناحق قتل کر دیا تھا اور گذشتہ دورِ حکومت میں قاتل کی شخصیت کے اثر سے اس کا بدلہ نہ لیا گیا تھا تو اب حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ خلیفہ ہونے کے بعد اعلان کر دیتے ہیں کہ اس ایرانی کے خون کا بدلہ لیا جانا قاتل سے ضروری ہے۔ اسلامی قانون میں عرب اور غیر عرب اور بڑے اور چھوٹے کی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عبید اللہ بن عمر جا کر حضرت علیؑ کے فریق مخالف یعنی معاویہ کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر میدانِ جنگ میں حضرت علیؑ کے مقابلہ میں آ کر قتل ہوتے ہیں۔

کیا اس سے اسلام کی اس بین الاقوامیت کا جو اسکا طرۂ امتیاز ہے ایرانیوں کو اندازہ نہ ہوا ہوگا اور کیا اس سے انہیں اسلام کے بلند اصول کے ساتھ ہمدردی نہیں پیدا ہوئی ہوگی؟

دوسرا واقعہ ایران کی شاہزادی کا حضرت امام حسینؑ کے عقد میں آنا تا کہ ایرانیوں اور

عربوں میں رشتۂ اتصال قائم ہو جائے۔ اور ملک و قوم کی تفریق کے مٹا دینے کا عملی سبق دنیا کو دیا جائے اسوقت جب شہنشاہ فارس کی بیٹی کے دامن پر کنیزی کا داغ آرہا تھا، امیرالمومنینؑ نے اپنے عزیز فرزند کے ساتھ اس کا عقد کر کے اس کو دنیائے اسلام کی ملکہ بنا دیا۔

کیا اس سے بڑھ کر ایران کو اسلام کا گرویدہ بنانے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ آئندہ کے ہونے والے اسلامی پیشوا (زین العابدین) اگر ایک طرف ملک عرب کے دینی شہنشاہ (محمدؐ و علیؑ) کے پوتے ہیں تو دوسری طرف ملک فارس کے شہنشاہ (یزدجرد) کے نواسے بھی ہیں اسکا نتیجہ تھا کہ مفتوحانہ نفرت جو ایران کو فاتح قوم اور اسکے مذہب سے ہونا چاہئے تھی دور ہو گئی اور اگر رہی بھی تو صرف ان اشخاص سے جنہوں نے براہِ راست ان پر فوج کشی کی تھی۔ لیکن اسلام اور رہنمایانِ اسلام سے مذہبی طور پر انہیں کوئی نفرت نہیں باقی رہی۔ بلکہ دلی محبت و الفت اور والہانہ شیفتگی و گرویدگی پیدا ہو گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسکے بعد اسلامی علوم اور مذہب کی جتنی خدمت ایران نے کی اتنی خود عربوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

چاہے سوادِ اعظم کے وہ قدیم اور متوسط دور کے علما ہوں، جیسے بیہقی، نسائی طبری، رازی، دوانی، جرجانی، نیشاپوری وغیرہ اور چاہے فرقہ امامیہ کے ہر دور کے علما ہوں جیسے قمی، طوسی، خوانساری، اصفہانی، رشتی، شیرازی، مازندرانی، طہرانی، یزدی وغیرہ سب ہی سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک اور ثبوت ایران کے مذہبی شغف کا دیکھئے کہ ایران میں جمشید کا قائم کیا ہوا تہوار "نوروز" ہمیشہ منایا جاتا تھا۔ یہ "نوروز جمشیدی" کہلاتا تھا جو اعتدال ربیعی کے موقع پر قائم ہوتا تھا اس کے مقابل میں "مہرگان" تہوار تھا جو اعتدال خریفی کے موقعہ پر یعنی موسم خزاں میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کو اپنے قومی

تہواروں اور قومی شخصیتوں کے ساتھ محبت ہوا کرتی ہے مگر چونکہ نوروز ہی کا دن مطابق ہو گیا حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کی جانشینی کے دن سے تو ایران نے اپنے مخصوص تہوار کی قومی خصوصیت کو قربان کر دیا۔ اس مذہبی خصوصیت پر جو اس تاریخ کو حاصل ہو گئی تھی اور نوروز بجائے "نوروز جمشیدی" ہونے کے "نوروز اسلامی" اور "نوروز علوی" بن گیا۔ اب اس میں اسلامی نماز پڑھی جاتی ہے اور حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اوصاف و مناقب بیان ہوتے ہیں اور جمشید کے ساتھ جو اس دن کا تعلق تھا وہ صرف تاریخ کے اوراقِ پارینہ کی زینت بن کے رہ گیا ہے۔

یہ وارفتگی اور شیفتگی مذہب کے ساتھ بضرب شمشیر فتح سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں آلِ محمدؐ کے اس اخلاقی جذب کی تاثیر ہے جس کی امیرالمومنین حضرت علیؑ نے ابتدا کی اور آلِ محمدؐ میں سے ہر فرد نے جسکو برقرار رکھا اور امام رضاؑ نے اپنے ولیعہدی کے دور اور زمانۂ قیام خراسان میں جسکو لازوال زندگی بخشدی

یاد رکھئے کہ دنیا کے ہر انسان کے چال چلن کا اثر دوسروں پہ پڑتا ہے۔ ہر شخص لامعلوم طریقہ پر اپنے افعال و حرکات سے دوسروں پہ اچھا یا برا اثر ڈالتا رہتا ہے اور وہ دوسرے اپنے علاوہ دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے اس لحاظ سے کسی نیک شخص کی پارسائی، رحمدلی، فیاضی، ملنساری، ہمدردی وغیرہ اوصاف کو اہمیت نہ دینا غلطی ہے۔ مگر تاریخ کا ایک خاصہ ہے کہ وہ حرکت کو دیکھتی ہے سکون پہ نظر نہیں ڈالتی۔

اگر آپ ملکوں کی تاریخ قوموں کی تاریخ اور شخصیتوں کی تاریخ کو پڑھئے تو آپ کو جنگ ہنگامہ، شورش، اور آویزشوں کے حالات بڑے شرح و بسط کے ساتھ ملیں گے لیکن عباد و زہاد کی عبادتوں، ریاضتوں اور تعمیر خلق کی کوششوں کا تذکرہ اکثر ملے ہی گا نہیں اور ملے گا تو ضمنی طور پہ سرسری طریقہ سے اور اختصار کے ساتھ

تاریخ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی - چنانچہ فارس و روم کے غزوات تاریخ کے صفحات پر چھا گئے - فتوح الشام، واقدی اور فتوح البلدان، بلاذری اسم بامسمیٰ ہو کر ان ہی موضوعات کی حامل بن گئیں - مگر یہودیوں کے باغ میں آب کشی کر کے بسر اوقات کرنے والا پیغمبر اسلام کا جانشین اس دور کی تاریخ میں ڈھونڈے نہیں ملتا - حضرت علیؑ کے علاوہ دیگر اماموںؑ کے واقعات زندگی صفحات تاریخ پر نہ آ سکے - کیونکہ ان میں کمانوں کی کڑک، تیروں کی لچک اور تلواروں کی چمک نہ تھی - مگر خالد بن ولید سے لے کر ابو مسلم خراسانی تک جتنے جرنیل اور کرنیل تھے سب تاریخی شخصیت بنے ہوئے ہیں - کیونکہ یہ شخصیتیں دنیا کی خاموش فضا میں تلاطم پیدا کرنے کی وجہ سے تاریخ کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور زین العابدینؑ، محمد باقرؑ، جعفر صادقؑ، موسیٰ کاظمؑ وغیرہ اپنی عبادات اپنے علم، اپنے صدق، اپنے ضبط نفس وغیرہ صفات کمال سمیت تاریخی معیار پر پورے نہیں اترتے اس لئے کہ وہ اپنی خاموش سیرت کے ساتھ دنیائے اسلام کی تعمیر میں کتنا ہی حصہ لے رہے ہوں مگر ان کی زندگی میں سکون ہے اور سکون تاریخ کا جزو بننے کے قابل نہیں - اس صورت سے جو اسلامی تاریخ مرتب ہوئی ہوتی اس میں یقیناً بس وہ خون آشام کارنامے ہوتیں جو اشاعت اسلام کے نام پر فتوحات کی حیثیت سے آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کی صورت میں ہوئیں اور ایسی تاریخ سے مسلمان اپنی جگہ کتنی ہی نازش محسوس کرتے مگر غیر اقوام کی ہمدردی کا سرمایہ ان میں دستیاب نہیں ہو سکتا تھا -

ضرورت تھی ایک ایسے واقعہ کی کہ جس میں ہو تو نوعیت جنگ کی، ہو باہمی تصادم اور کشمکش، زمین پر بہتے ہوئے خون اور تڑپتے ہوئے لاشے ہوں فتح اور شکست اور غالب و مغلوب کا انجام ہو، خلاصہ یہ کہ وہ سب باتیں ہوں جن کی وجہ سے تاریخ کی نگاہ اٹھتی ہے - جن کی وجہ سے تاریخ اپنی آغوش

کو کھو دیتی ہے اور واقعات کو جگہ دے دیتی ہے۔ مگر اس جنگ کی تہہ میں اسلام کے سچے اصول کی جاذبیت، اس کی مساوات و اخوت، اس کی خلق خدا کے ساتھ ہمدردی۔ اس کی حقوق اللہ و حقوق الناس کی محافظت اور اس کی انسانیت کی تعمیر میں تمام کوششوں کا نچوڑ اس طرح مضمر ہو کہ اس جنگ کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں ایسی ہی یا اس سے بہتر تاریخی زندگی حاصل کر لیں جیسی فتوحات ملکی والی لڑائیوں کو حاصل ہے۔

اس واقعہ کے وجود کی وجہ سے تاریخ اسلام میں غیر اقوام کے لئے وہی جاذبیت اور وہی مقناطیسیت پیدا ہو سکے گی جو اصل اصول اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی سیرت و زندگی میں موجود تھی اور جس پر فاتحانہ لڑائیوں نے نفرت کے جذبات کا پردہ ڈال کر اقوام عالم کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ واقعۂ کربلا بس ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یہ ایک جنگ تھی اور جنگ بھی انوکھی خصوصیتوں اور مخصوص ندرتوں کی حامل جن کی وجہ سے کسی دوسری جنگ سے زیادہ تاریخ اس کو محفوظ رکھنے پر مجبور تھی۔ یہاں بھی کھنچی ہوئی تلواریں تھیں۔ لچکتے ہوئے نیزے تھے۔ کڑکتی ہوئی کمانیں، اور سنسناتے ہوئے تیر تھے۔ زمین پر بہتا ہوا خون کٹتے ہوئے سر اور تڑپتے ہوئے لاشے اور پھر جنگ ایسی جس میں ایک طرف تیس ہزار اور دوسری طرف بہتر۔ ایک طرف سیر و سیراب اور دوسری طرف تین دن کے بھوکے پیاسے، ایک طرف تن و توش والے قدآور جوان اور دوسری طرف چند جوانوں کے علاوہ اسی برس کے بڈھے اور کمسن بچے۔ کون سی دنیا کی جنگ ایسی ہوگی جس میں قاسمؑ ایسے نابالغ کمسن کا کیا ذکر علی اصغرؑ کا سا شیر خوار بھی قربان ہوا ہو۔

لہٰذا بحیثیت جنگ کے تاریخ مجبور تھی کہ اس واقعہ کے خصوصیات کو محفوظ کرے۔ اب اگر یہ جنگ بھی کھلم کھلا کسی غیر مسلم جماعت اور دوسری قوم کے مقابلہ

میں ہوئی ہوتی تو غیر اقوام کو اس سے ہمدردی نہ پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ اسے اسلام کی دوسری لڑائیوں کے ساتھ جو اقوامِ غیر اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہوئی ہیں۔ منسلک کر کے اس سے غیریت بلکہ مخاصمت محسوس کرتیں۔ مگر اس جنگ کی خصوصیت یہ تھی کہ رسمی طور پر کسی ایک مذہب کی حمایت میں دوسرے مذہب کے خلاف نہ تھی۔ بلکہ ظاہری طور پہ ایک ہی مذہب (اسلام) کے پیروؤں میں جو لوگ اس کے اخلاق اور بلند تعلیمات سے ہٹ گئے تھے۔ ان کے خلاف لڑی گئی تھی اس لئے دنیا کی دوسری قوم کو اس سے مخاصمت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور انہیں اس کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ان سے اسلام کے ان اصول اور اخلاقی حدود کا تعارف ہوتا ہے جو حسینؑ اور یزیدؒ کے درمیان خطِ فاصل بنے ہوئے تھے اور وہ جب حسینیت کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ان اصول پر غور کرتے ہیں تو ان کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکہ قائم ہوتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جو پیغمبرِ اسلامؐ کے پیش نظر تھا اور جس کی حسینؑ نے اپنے خون سے تکمیل کی۔

یہ ایک بڑی خصوصیت ہے واقعۂ کربلا کی جو اسے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا مالک بنا دیتی ہے یعنی اگر تاریخ اسلام سے واقعۂ کربلا کو نکال لیا جائے تو غیر اقوام کی ہمدردی کے لئے کوئی چیز ہمارے پاس نہیں رہ جاتی اور یہ ایک ثابت حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو حسینی واقعات سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

پھر امام حسینؑ نے اپنے واقعات کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو ایسا مدغم کر دیا ہے کہ حسینی تاریخ بغیر ان تعلیمات کے تذکرہ کے مرتب ہی نہیں ہو سکتی اور اس طرح ان واقعات کے ساتھ وہ تعلیمات بھی قہری طور پر تاریخ کا جزو بن گئے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے واقعۂ کربلا کی تاریخی حیثیت ایک مخصوص نوعیت

کے ساتھ وابستہ ہے۔

خم شمشیر تاریخ کا جزو بنتا ہے مگر خم محراب نہیں۔ تیروں کی بارش تاریخ کی توجہ مبذول کرتی ہے، خوف الٰہی سے آنسوؤں کی بارش نہیں۔ پھڑکتی ہوئی لاشوں کو تاریخ دیکھتی ہے، سجدۂ الٰہی میں زمین پر گری ہوئی پیشانیوں کو نہیں۔ مگر حسینؑ نے کربلا میں یہ کیا کہ تیروں کی بارش میں نماز جماعت ادا کی۔ اب کیا ممکن ہے کہ تاریخ اس نماز کو نظر انداز کر دے، خنجر کی دھار کے نیچے خالق کا سجدہ کیا، اب کیا مجال کہ تاریخ اس سجدے سے آنکھ بند کر لے۔

اس طرح امام حسینؑ نے تعلیمات اسلام کو تاریخی زندگی کا لباس پہنا دیا جس کی مثال واقعۂ کربلا کے سوا تاریخ اسلام کے کسی واقعہ میں نہیں مل سکتی۔

کربلا میں مادیت پرستی اور حق پرستی کا مقابلہ صاف نظر آتا ہے۔ جب میدانِ جنگ میں صفیں مرتب ہوتی ہیں اور فوج شام کا افسر عمر بن سعدؒ تیر چلہ کمان میں جوڑ کر حضرت امام حسینؑ کی طرف رہا کرتا ہے، پکار کے اپنی فوج کو آواز دیتا ہے کہ گواہ رہنا پہلا تیر فوجِ حسینؑ کی جانب میں لگا رہا ہوں۔ یہاں گواہ کیے جا رہے ہیں فوج کے سپاہی۔ کا ہے کے لئے؟ حاکم وقت کے سامنے گواہی دینے کے لئے۔ صاف ظاہر ہے کہ صرف مخلوق کی رضامندی اور مادی فائدے کا حصول مدِ نظر ہے۔ اور ادھر جب حسینؑ کا جوان بیٹا رخصت ہو کے مرنے چلتا ہے تو زبان پر کیا الفاظ آتے ہیں؟ خداوندا! گواہ رہنا کہ اب وہ جوان جا رہا ہے، جو صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ کی تصویر ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف اللہ کی خاطر اور خالق کی رضامندی کے لئے۔

کیا تاریخ کربلا کی جنگ سے اس خدا پرستی کے مظاہرہ کو الگ کر سکتی ہے؟ نا ممکن ہے

اس سے بڑھکر یہ ہے کہ گھریلو واقعات جن میں قرابتداروں کے باہمی حقوق گھر والوں کے ساتھ برتاؤ - باہمی محبت وسلوک کے کیسے ہی تابناک عمل کے جواہرات ہوں مگر تاریخ انہیں مڑکر نہیں دیکھتی -

حضرت امام حسینؑ کربلا میں اپنے عزیزوں کو اور اس سے بھی بڑھ کر اہل حرم یعنی بی بیوں اور بچوں کو ساتھ لائے اور اب حسینی کارنامہ کے ذیل میں اعزا کے حقوق قرابتداری بہن اور بھائی کی غیر معمولی محبت - شوہر اور زوجہ کی باہمی وفاداریاں غرض کتنے ایسے زندگی کے پہلو مضمر ہو گئے ہیں جنہیں عموماً تاریخ اپنے دامن میں لیتی ہی نہیں اس کا قطعی ثبوت چاہتے ہوں تو یہ دیکھئے کہ آخر حضرت امام حسینؑ ۱۰ر محرم ۶۱ھ کے پہلے بھی تو امام حسینؑ ہی تھے - یقیناً آپ کی پوری زندگی ہی حقوق اللہ اور حقوق الناس اور اعزاء کے ساتھ صلۂ رحم اور گھر والوں کے ساتھ مراعات میں ایسی ہی مثالی تھی کہ جیسی وہ کربلا کے میدان میں نظر آتی ہے - مگر کیا بات ہے کہ ستاون برس کی عمر میں صرف ایک ہی دن کے جزئیات وواقعات ہیں جو تاریخ کی زبان سے ہم تک پہنچے ہیں اور اس دن کے پہلے کے ستاون برس کے واقعات ہرگز مسلسل اور مرتب طور پر ہمیں دستیاب نہیں ہوتے اب تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ صرف واقعۂ کربلا کی خصوصیت ہے کہ اس میں رزمیہ کارنامہ کے ساتھ چونکہ زندگی کے دوسرے پہلو منسلک ہو گئے تھے اس لئے انہیں تاریخی زندگی حاصل ہو سکی - اور اب آپ کو واقعۂ کربلا کی مخصوص اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی - جس نے تمدن اسلامی کے ہر اجتماعی اور انفرادی معاشرتی اور منزلی پہلو کو اس طرح تاریخ کا جزو بنا دیا جو بغیر اس کے قطعاً ناممکن تھا ؛

علی نقی النقوی

امامیہ مشن کے مطبوعات ملنے کا پتہ :- سید حسن علی شاہ کاظمی جنرل سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان - لاہور ،

(مطبوعہ - تعلیمی پریس لاہور)